Date of Publication: 16-10-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 Oct. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 October 2013
Issue: 40, Vol.: 72

۲۲ تا ۲۸ر اکتوبر ۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر: ۴۰، جلد نمبر: ۷۲

فہمیدہ ریاض کا یہ مضمون 'شعر و حکمت' جلد اول کتاب 11 (جولائی 2010، حیدرآباد) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے اردو اداروں کے حال زار اور ان اداروں کو خونِ جگر سے سینچنے والوں کے ساتھ برِ صغیر کے اردو والوں کے رویے پر روشنی پڑتی ہے اسی لیے یہ مضمون یہاں ڈائجسٹ کیا جارہا ہے کیوں کہ یہ رویہ اگر جلد تبدیل نہ ہوا اور ہماری حکومتوں اور اس کے ذمہ داروں کے کام کرنے کے طریقے اگر جلد نہ بدلے تو برِ صغیر کے اردو والوں کے پاس رونے کے سوا کچھ بھی نہ رہ جائے گا۔ (ادارہ)

فعلِ متعدّی

فہمیدہ ریاض

پہلی قسط

ٹھیک دس بج کر تیرہ منٹ پر میں نے یہ آواز سنی۔

"تو اے عورت اب کیا ہونا چاہیے اور اس کے لیے کیا کرنا لازم ہے"۔

جیسا کہ آپ نے پہلے ہی بہ خوبی اندازہ لگایا کہ یہ آواز کسی اور کی نہیں بلکہ اسی شے کی تھی جسے راجندر سنگھ بیدی نے اپنے ایک افسانے میں اندر آتما کا نام دیا۔ حیرت انگیز طور پر یہ آواز غیر نسوانی تھی۔ وہ مجھے 'اے عورت' بھی محض عادتاً کہہ رہی تھی۔ تو کیا عورت کی آتما، جس میں کہ اندر آتما ہوتی ہے، عورت نہیں ہوتی؟ میں نے اسی لیے کچھ حیرت سے سوچا۔ ایسا نا چیز کا خیال نہیں۔ نا چیز کا خیال تو یہ ہے کہ عورت کی آتما بالکل عورت ہی کی شکل و صورت کی ہوتی ہے۔ یعنی اگر آپ اسے شکل و صورت دے سکیں تو وہ عورت ہی جیسی بن سکتی ہے۔ لیکن یہاں تو معاملہ اندر آتما کا تھا۔

تو یہ کوئی جیکس لیس ہی شے تھی۔

اس موضوع پر غور کرنا چھوڑ کر میں نے اس کے پوچھے ہوئے سوال پر غور کرنا شروع کیا۔

میں اردو ڈکشنری بورڈ کے بڑے کمرے میں ایک بڑی میز کے سامنے بڑی کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے ان کا مدیر اعلا مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض گزاری تھی کہ اردو ڈکشنری ناچیز میرے بس کی بات کیوں کر ہوسکتی ہے جب کہ مجھے تو یہ علم بھی نہیں کہ فعل متعدی کیا بلا ہے۔ میرے علم کے مطابق تو صرف بیماریاں متعدی ہوتی ہیں جو شاملِ فعل نہیں ہوتیں۔

میرے ایک ذہین و ہونہار جواں سال دوست نے ماتھے پر علامہ اقبال کی طرح انگلی رکھ کر سوچتے ہوئے کہا تھا۔

''جو فعل متعدد بار کیا جائے، وہ فعل متعدی ہوسکتا ہے''۔

''نہیں، میں نے اسے درست کیا تھا۔ ''وہ فعل متعدی ہوگا''۔

''یا تو پھر فعل بد یا فعل قبیح ہوتا ہے''۔ اس نے کہا۔

''شش!'' میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ''یہ سرکاری دفتر ہے۔ یہاں واہیات باتیں نہ کرو''۔

''اچھا! باہر نکل کر کریں گے''۔

''شش!'' میں نے اسے پھر چپ کرایا۔

''امید ہے کہ ڈکشنری میں اس قسم کے فعلوں کا ہرگز کوئی تذکرہ نہ ہوگا''۔ میں نے کہا۔

وہ تو چائے پی کر اور کراچی کی نم ہواؤں سے بھورے پانی میں تبدیل ہوجانے والے بسکٹ کھا پی کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے تسلی کے لیے ڈکشنری کی جلدیں کھول کھول کر افعال قبیح کو چیک کیا۔ تمام کے تمام اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ موجود تھے بلکہ اسناد کے طور پر اردو کی قدیم ترین کتابوں سے لیے ہوئے اشعار بھی درج تھے۔

جس پر اے عورت نے پُرمسرت تعجب لگایا۔

ہنس کر ٹشو پیپر سے چہرہ پونچھ کر اور ایک گلاس پانی پی کر میں ڈکشنریوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔ کسی دوسرے دفتر میں ایک مضمون لکھنے کے سلسلے میں اس کی ایک آدھ جلد کو میں نے دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت یہ پوری کی پوری اکیس جلدیں میرے سامنے تھیں اور میں جستہ جستہ ان کے اوراق پڑھ رہی تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں 'اے عورت' کی اندر آتما متحرک ہوگئی۔ سکتے کے سے عالم میں بیٹھی تھی میں وہاں، کیسا عجیب اتفاق! ریوڑیوں کی طرح عہدے بانٹنے کی اندھا دھندی کیسے، ادھر میری ملازمت حاصل کرنے کی ضرورت کی مجبوری، لیکن تقدیر کے کسی پھیر نے مجھے مولوی عبدالحق کی کرسی پر لا بٹھایا تھا اور میرے سامنے تھیں ان کی آغاز کردہ ڈکشنری کی اکیس جلدیں۔ وہ ڈکشنری جو قدیم گریٹر آکسفورڈ ڈکشنری کے تاریخی یا لسانی اصولوں کے تحت بنائی گئی تھی۔ جس کے مطابق زبان کے تمام یا تقریباً تمام الفاظ اپنے آغاز اور بدلتے ہوئے یا وسعت پذیر معنوں کے ساتھ، اس طرح درج تھے کہ مختلف ادوار کی کتابوں اور مخطوطات، غرض ہر دستیاب تحریر سے لفظ کے استعمال اور معنی کی اسناد بھی مندرجات میں شامل تھیں۔

''اے اللہ پاک!'' میں نے کہا۔

(ایسے موقعوں پہ یہ ملحد و مشرک کافر عورت اس نوعیت کے کلمات لب پر لاتی ہے) کبھی کسی نے ایک شاندار کارنامہ کرنے کی ٹھانی تھی۔ ایک شاندار خواب دیکھا تھا اور وہ پورا ہورہا ہے! ایک مسلسل ناکام ہوتی ہوئی ریاست میں... جس کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی، جس سے کسی خیر کی توقع بھی کوئی اب نہیں کرتا۔ وہاں یہ کام ہوتا رہا اور ہوتا رہا، اور اب تکمیل پانے والا ہے۔ اس کو کسی چھوٹے ہوئے معجزے کا نام دیا جاسکتا ہے۔

پل کی پل میں وہ مضحکہ خیز طور پر بڑا کمرہ، اس کے گردآلود پیلے پردے، بدرنگ قالین، مضحکہ خیز طور پر بڑی جسامت کی میز اور اس پر رکھا ہوا سستا، واہیات دفتری سامان، سب کچھ غائب ہوگئے۔ اب یہاں بیتے ہوئے زمانوں کی خوشبو تھی۔ گم گشتہ صدیوں کی روح تھی۔ چلے جانے والوں کی ارواح اس کمرے میں گردش کررہی تھیں اور بہت قدیم کتابوں کے زرد مسکتے کاغذوں کی مہک!

''اس ڈکشنری کی جلدوں میں'' چار دن بعد وزارت سے آنے والے بندے سے میں نے کہا۔ ''ہندستان کا ہزار سالہ تمدن اور تہذیب محفوظ ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ...!''

یہ صاحب جو وزارت سے آئے تھے، انھیں وزارت کی اصطلاح میں اب 'بندہ' کہا جاتا ہے۔ یہ پنجابی کا لفظ ہے۔ شاید علامہ اقبال نے پہلی بار اردو میں استعمال کیا تھا۔ تعجب ہے کہ اب تک ہمارے کراچی کانوں کو عجیب سا لگتا ہے۔ شروع میں تو کچھ بھی نہیں تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب لڑکپن میں، میں نے اقبال کا یہ شعر پڑھا تھا:

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

تو میرے ذہن میں 'بندوں' کا مطلب بھی بیٹھا تھا کہ علامہ اللہ کے بندوں کا ذکر کر رہے ہیں، کیوں کہ ہماری طرف کی اردو میں تو بندے صرف اللہ ہی کے ہوتے ہیں۔ "ارے بھئی، اللہ کے بندے، میری بات تو سنو"۔ اس طرح کہا جاتا ہے، لیکن یہ صاحب یا شخص تو کچھ کچھ بندے جیسے لگ بھی رہے تھے۔ یعنی وہ بندہ جو پنجابی میں ہوتا ہے جسے اس طرح کہتے ہیں "ہوا ایک بندہ آئے گا"۔ بغیر استری کے عوامی سوٹ میں ملبوس اور چہرے پر ایسا دیہاتی تاثر جسے کلوز شیو کے ذریعے بدلا نہیں جا سکتا۔ لیکن پھر بھی میری مدد کرنے آئے تھے اس لیے میرا کراچوی دل انھیں بندہ کہنے پر آمادہ نہیں تھا۔

ان صاحب نے ہزار سالہ تاریخ کے الفاظ سن کر کہا "اتنی پرانی تو خیر اردو نہیں"۔

"جی ہاں، مگر جو کچھ لکھا گیا، جب سے لکھا گیا، وہ تو پرانے زمانوں کے نہ صرف بارے میں تھا بلکہ پرانے زمانے میں وہ چیزیں بھی موجود تھیں۔ داستانوں ہی کو لیجیے۔ اب شہزادی نے کردھنی پہن رکھی ہے۔ تو کیا کردھنی ہزار برس پہلے نہ تھی"۔

پھر کچھ مورتیاں یاد کرتے ہوئے میں نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دیا۔ "بالکل موجود تھی۔ ٹیکسلا کے فریسکوز میں بعض عورتوں نے کردھنی پہن رکھی ہے"۔

مولوی عبدالحق اردو کے شیدائی تھے۔ ڈکشنری کی ورق گردانی کرتے ہوئے میں نے دیکھا تھا، بعض جگہوں پر خالص ہندوستانی الفاظ کو دیوناگری رسم الخط میں لکھا گیا تھا تاکہ پڑھنے والا بالکل صحیح تلفظ سے واقف ہو سکے۔ دیوناگری میں!! پور ڈیئر اولڈ سول! ان کو کیا پتہ، بھولے بھالے انسان کو، اردو سے عشق کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے کہ آگے چل کر اس رسم الخط کو قابلِ نفرت قرار دیا جا سکتا ہے جو اسلام اور نظریۂ پاکستان کے حق میں زہرِ قاتل مانا جائے۔

ایسا کچھ میں سوچ رہی تھی۔ تب عورت نے اضافہ کیا۔

جس طرح ہندوستان میں اردو کے رسم الخط کو ہندو دھرم اور ہندوستان کی اکھنڈ ایکتا کے خلاف سمجھا گیا جس سے کہ پوتر ہندو دھرم فی الفور بھرشٹ ہو جائے۔

تو انسان اتنے تنگ دل ہیں۔ اتنے کم ظرف ہیں۔ تعصب ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ دل کو کشادہ نہیں کرتے۔ دل کو کشادہ!

مجھے یاد آ رہا تھا۔ چند برس پہلے اسلام آباد میں ہونے والی کئی روزہ اردو کانفرنس میں اس قسم کی قرارداد پیش کی جا رہی تھی۔

اردو میں پاکستان کی دوسری قومی زبانوں، مثلاً پنجابی، پشتو وغیرہ کی شمولیت کی ہمت افزائی کی جائے۔ یہ سن کر مجھے کتنی سخت کوفت ہوئی تھی۔ ہمت افزائی کرنا کیا معنی! ابھی جو الفاظ آ جائیں گے سو آ جائیں گے۔ میں سوچ رہی تھی۔ بس یہ کسر رہ گئی ہے کہ قرارداد میں یہ شق بھی شامل کر دی جائے کہ ٹکسالی زبان درست لہجے میں بولنے پر جرمانہ عائد کیا جائے گا۔

مگر میں کچھ بولی نہیں تھی۔ بس چپ بیٹھی رہی تھی۔ تو کیا میں دل کو کشادہ نہیں کر رہی تھی۔ واہ یہ بھی بھلی چلائی۔ دل کو کشادہ کرنے کے لیے ہم ہی رہ گئے ہیں؟ ہونہہ۔ پھر دل ہی دل میں تحریکِ پاکستان چلانے والے یوپی، سی پی، بہار کے جلوسوں کا حصہ بھی چڑایا تھا (ب) اور بنا ہے اردو کو پاکستان کی قومی زبان! بہ قول پنجابی محاورہ "ہور چوپو!" اب بنا ہے اردو کی درگت! یہاں پھول کو پول کہیں گے اور بھائی کو پائی یا پاہی، اور کہنے پر کیا منحصر ہے، کچھ دنوں میں یہی لکھا بھی جانے لگے گا۔ اسی اردو کو بچانے کے لیے بنوایا تھا پاکستان؟ یہاں تو کوئی سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ عظیم الشان ملک کی قومی زبان جائے بھاڑ میں، اس آبادی میں اب کوئی کروڑ بھر لوگوں کی مادری زبان بھی تو ہے اردو...

اس وقت تو یہی خیالات دماغ میں آئے تھے۔

عین ان گھڑیوں میں شاید تمام زبانوں کے ان گنت الفاظ اپنی بولیوں سے نکل نکل کر دوسری بولیوں میں کھٹا کھٹ داخل ہو رہے تھے۔ انھیں نہ قرارداد کی ضرورت تھی اور نہ کسی پروانۂ راہداری کی حاجت۔ آدمی بول رہے تھے۔ گلیوں اور بازاروں میں ٹہلتے کھیلتے آدمی، گھروں میں ملازماؤں سے بتیاتی عورتیں، ذاتی پنساری، دلال، کرتی۔ انسانوں کی جھنڈ ہمیشہ کی طرح سماجی عمل سے بے نیاز اور مخالف!

"ہم جو چاہتے ہیں تو بے نیاز ہوتے ہیں کہ ہم اس کے الٹ ہی عمل کرتے ہیں"۔ عورت نے مشاہداتی بیان جاری کیا۔

اور پھر اردو دانی صاحب کیا بات ہے اردو کی...

عورت نے سنجیدگی پر خفیف تبسم سے یاد کیا:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

تو لکھوا دیا جائے یہ شعر اس عمارت کے ماتھے پر؟ پھر سوچا نہیں اوچھا پن لگے گا۔ اردو اور دوسری زبانوں کے لسانی پہلوان رانوں پر ہاتھ مارتے اکھاڑے میں اتر آئیں گے اور دھر کے پٹخیں گے ایک دوسرے کو۔ یہ تصور کر کے عورت ہنسنے لگی۔

وزارت سے آنے والے صاحب حیران ہوئے کہ یہ جو بیٹھی ہیں تو کردھنی پر کیوں ہنس رہی ہیں۔

"کر... دھنی"۔ انھوں نے تذبذب سے کہا۔

"جی ہاں... ایک بار میں نے بھی خریدی تھی"۔

"چاندی کی تھی..." اسے یاد آ رہا تھا، یہ تقریباً پچھلے جنم کی بات تھی۔ مگر کتنی خوب صورت!

"پھر کیا ہوا؟" ان صاحب نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا... کچھ دنوں تک پہنی"۔

وہ پھر اپنے خیالوں میں گم۔

"ارے بھئی ریختہ میں شاعری کرنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ اپنے فارسی دانی میں کر لیا کیجیے"۔

کیا غالب نے کسی نالائق شاگرد کو مشورہ دیا تھا؟ ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب، تو گویا اردو میں کوئی خاص بات تھی؟ بہت ہی خاص بات! محاورے کا مزہ۔ کہنے کا خاص انداز۔ جی ہے کہ اُمڈا آتا ہے... کھائیں گے تو گئی ہے نہیں تو جائیں گے جی سے۔ کیا جی ہو رہا ہے؟ جی نہیں چاہتا۔

اچھا؟ تو گویا نہایت ہی گنگا جمنی تھی اردو... (پھر وہی گنگا پھر وہی جمنا) یعنی ہندوستانی بولا جس میں فارسی شاعروں کی پیوند کاری کی گئی۔ تو اس نہایت ہندوانہ لفاظی کو صرف مسلمانوں کے ملک کی قومی زبان بنانے کی کیا تک تھی؟

اس نے سوچا۔

پھر خود ہی جواب دیا۔ "تک تھی رسم الخط۔ جو فارسی تھا۔ یعنی عربی کی ایک شکل اور عربی قرآن شریف کی زبان ہے"۔

اب تک وہ صاحب جو کہ وزارت سے آئے تھے نہ جانے کیا کچھ سوچ کر اداس ہو چکے تھے اور زیر لب کہہ رہے تھے۔

"اب پنجابی زبان کو دیکھیے ہمارے ہاں ایک لفظ ہے "ون" انھوں نے نون کی آواز میں ڑے کو گھول کر کہا۔ اب اسے ہم کیسے لکھیں گے؟"

عورت نے کاغذ پر سندھی کا ڻ بنایا اور کہا۔

"سندھی میں اس طرح لکھتے ہیں۔ نون کے پیٹ میں طوے بنا دیتے ہیں"۔

اور ایک لفظ ہے "جنا" (پھر ڑے کی آواز نون میں شامل تھی) جس کا مطلب ہے کوئی پچیس سے تیس تک کا بڑا تگڑا جوان۔ اس کا تو کوئی متبادل ہی نہیں اردو میں۔ اور اردو اسکرپٹ میں تو اسے لکھا ہی نہیں جا سکتا۔

آپ لوگوں کو... ان مسائل سے نمٹنے کے لیے بیٹی... آپ سندھی رسم الخط اپنا سکتے ہیں"۔

پھر اضافہ کیا۔

"اردو سے یہ آوازیں نکل گئیں... یہ ایک شہری زبان ہے دراصل..."

پھر یہ سوچ کر کچھ گھبرائی اور کچھ شرمندہ ہوئی کہ اس کی کہی ہوئی بات سے ایک عجب قسم کا احساسِ برتری اور سرپرستانہ تفاخر تو نہیں جھلک رہا۔ جلدی سے ان صاحب کی طرف دیکھا۔ مگر وہ اتنے حساس نہ تھے۔ یوں نہیں لگ رہا تھا جیسے انھوں نے برا منایا ہو۔ وہ کچھ متفکر لگ رہے تھے۔ مگر وہ اس کی مہمان داری پر خوش تھے اور اسے پسند کر رہے تھے۔ عورت بے حد مشکور ہوئی۔ کیسا پیارا سا آدمی تو بیٹھا تھا اس کے سامنے۔ ساری جوانی، وزارت میں بتا کر اس نے پبلک ایڈمنسٹریشن کے ان گنت قوانین یاد کیے تھے۔ وہ اس کی مدد کرنے آیا تھا۔

عورت کی درخواست پر اس نے بہت ہمدردی اور فخر سے اس کے لیے اس ڈکشنری بورڈ کا نیا آرگنو گرام بنا دیا تھا۔

عورت کو تو نہیں پتا تھا کہ کون سے عہدے کو کس بی ایس گریڈ میں ہونا چاہیے۔ پھر پروموشن کے لیے کون سے دوسرے عہدے ہونے چاہئیں۔ کتنے فیصد باہر سے لیے جائیں اور کتنے پروموشن کے ذریعے بھریں، وغیرہ۔

پنڈی گھیب میں کہیں ان کا گاؤں تھا نہیں، پوٹھوہار نہیں... یہ مرکزی خاص الخاص پنجاب ہے۔ اس نے بتایا تھا۔ کوئی گاؤں، جس میں وہ درخت ہوں گے جن کا نام وہ لے رہا تھا اور جہاں گبھرو جوان رہتے ہیں۔ جیسا وہ خود بھی رہا ہو گا۔ اس نے وزارت کی راہداریوں اور دم گھونٹ دینے والے ایئر کنڈیشنڈ کمروں کو یاد کیا، جن کو اس نے بھی دیکھا تھا۔ یہ ایسے کیوں ہو گئے ہیں؟ کیا یہ ہر ملک میں ایسے ہی ہوتے ہیں؟ جیسے کافکا کے کیسل نے وہاں انسانوں کو کیڑا بنتے دیکھا؟

وہ وزارت کے صاحب کو چھوڑنے ایئرپورٹ تک آئی۔ تھینک یو... تھینک یو سو مچ!!

تو اس طرح میں اس چیستان میں داخل ہوئی۔ کیوں اور کیسے؟ جاننا چاہیں تو آگے پڑھیے۔

قسمت کے اس عجیب و غریب چکر نے مجھے اس کرسی پر لا بٹھایا اور ایسے دروازے کھولے اور اس دنیا میں جھانکنے کے سوا کوئی راستہ نہ چھوڑا جو میرے خواب و خیال میں بھی کبھی نہیں تھا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ ملازمت مل گئی تو کچھ دن سکون کے گزاروں گی اور پھر وہ کام کروں گی جو میں کرنا چاہتی ہوں کبیرا! مگر یہ کیا! یہ تو کچھ اور ہی دنیا نکلی۔ ماسوا اس عجیب اتفاق کے کہ عبدالحق اس ڈکشنری کا نام 'لغتِ کبیر' رکھنا چاہتے تھے۔ جیسے رومی کے دیوان شمس تبریز کو دیوانِ کبیر کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ پڑھ کر آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ پورا صفحہ بھیگ گیا کبیر، پھر مجھے لگا جیسے ہوا کے جھونکے کی طرح تم کمرے میں آ گئے ہو اور ہنس رہے ہو اور کہہ رہے ہو۔ سی نام! آئی ایم وِد یو۔

(باقی آئندہ)

مرہٹواڑہ میں اردو ڈرامہ

ہاجرہ بانو (پلاٹ نمبر 93، سیکٹر A سڑک لائن 13، حمایت باغ، اورنگ آباد 431008، مہاراشٹر)
E-mail: hajerabhno19@yahoo.com

مہاراشٹر کا دل مرہٹواڑہ جس میں سات اضلاع اورنگ آباد، ناندیڑ، پربھنی، بیڑ، عثمان آباد، لاتور اور جالنہ شامل ہیں۔

مرہٹواڑہ کی سرزمین ویسے تو بہادر اور جیالے لوگوں کی سرزمین ہے لیکن یہاں کی مٹی میں جذبات بھی کوٹ کوٹ کر بھرے ہیں ان ہی جذباتوں نے شاعری کی کونپل بن کر خود کو نظم و نثر کے روپ میں پیش کیا۔ یہی وجہ ہے مرہٹواڑہ میں ڈرامہ نگار کم اور شعراء زیادہ نظر آتے ہیں۔ چلئے یہ بھی اچھا ہے۔ اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ شاعری بھی ہے۔ لیکن ہمیں ادب کی دوسری اصناف کی طرف بھی مزید توجہ دینی چاہیے خاص طور سے ڈرامہ نگاری پر۔

ڈرامہ ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی کر کے دکھانا ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ادب ہے جس میں انسانی زندگی کی حقیقتوں اور صداقتوں کو اسٹیج پر نقل کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ ڈرامے کو عمل سے جڑا ہوا ادب بھی کہا جاتا ہے یعنی ایسا ادب جس کو مختلف فنون لطیفہ جیسے موسیقی، گیت، رقص اور مصوری کی مدد سے زیر عمل لایا جاتا ہے۔ ڈرامہ کی ایک تعریف اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ مکالموں کی شکل میں لکھی گئی وہ دیا تحریر جو ریڈیو، ٹی وی اسٹیج اور فلموں کے لیے ہوتی ہے۔ ڈراموں کی آٹھ قسمیں ہوتی ہیں۔ المیہ، طربیہ، فارس، اوپیرا، برلیسک، یک بابی، ریڈیائی اور ٹی وی یا فلمی ڈرامہ۔

ڈرامے کے پس منظر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ یہاں لیے ضروری ہے کہ ہم ان غلطیوں کی اصلاح کر سکیں جو زمانۂ ماضی میں سرزد ہوئی تھیں۔

اردو کا سب سے پہلا ڈرامہ واجد علی شاہ نے 1842ء میں تحریر کیا تھا۔ جس کا نام 'رادھا کنھیا' تھا۔ اس ڈرامے کو لکھنؤ کے شاہی محل میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد جس ڈرامے کو اردو ڈرامے کی تاریخ کا نقطہ آغاز کہا جاتا ہے وہ ڈرامہ 'اندر سبھا' ہے، جسے 1852ء میں آغا حسن امانت نے تحریر کیا تھا۔ اس نے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ جس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ دیگر زبانوں کی طرح اسٹیج پر اردو ڈراموں کی پیش کشی کے امکانات بھی روشن ہیں۔ چنانچہ اس ڈرامے کی کامیابی سے متاثر ہو کر اردو کے کئی تجارتی تھیٹر قائم ہوئے اور اس دور میں پارسی تھیٹر اردو ڈراموں کی طرف متوجہ ہوا۔ پارسی تھیٹر کے مالکین کو اردو سے کوئی خاص لگاؤ یا رغبت نہیں تھی۔ ان کا مقصد صرف تجارت تھا اور وہ اردو ڈرامے پیش کر کے صرف دولت کمانا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کے پیش کردہ ڈراموں میں کسی خاص فنی جہت کو تلاش کرنا عبث کار عبث ہے۔ ان ڈراموں کے موضوع عموماً تاریخی واقعات اور عشق و محبت کے فرسودہ واقعات ہوتے تھے اور اگر ڈرامہ اصلاحی بھی ہوتا تو اخلاقی اور سماجی مسائل کو نہایت بھونڈے انداز میں پیش کر دیا جاتا تھا۔ ڈرامے کی اس غلط روش میں سدھار اس وقت آیا جب ڈرامے کی باگ ڈور آغا حشر کاشمیری، بیتاب، حسن لکھنوی، کریم الدین مراد، طالب بنارسی اور مولوی سید ابوالفضل کے ہاتھوں میں آئی۔ ان ڈرامہ نگاروں نے ڈرامے میں تفریحی عناصر کو کم کر کے حقیقت پسندانہ رجحان دیا اور اس میں وہ خوبیاں پیدا کیں جن کا ڈرامہ متقاضی ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد جو ڈرامے تحریر کیے گئے ان کے موضوعات وہ قومی مسائل تھے جو بٹوارے کے سبب پیدا ہوئے تھے۔ قومی و سماجی مسائل کو جن ڈرامہ نگاروں نے موضوع بنایا ان میں قابل ذکر مولانا عبدالماجد، مجنوں گورکھپوری، عصمت چغتائی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک وغیرہ شامل ہیں۔

1965ء کے بعد تھیٹریکل کمپنیاں بند ہوتی گئیں اور وہ ڈرامہ نگار جو اسٹیج کے لیے ڈرامے لکھتے تھے اب ریڈیو کے لیے لکھنے لگے۔ جن میں ریوتی شرن شرما، کرشن چندر، محمد حسن، محمد مجیب، شفیع، ساگر سرحدی، اظہر افسر اور جمیل شیدائی وغیرہ شامل ہیں۔ آج کل ڈرامے ٹی وی سیریلس کے لیے لکھے جانے لگے ہیں۔

یہ تو تھا پس منظر کا ایک سرسری جائزہ۔ مرہٹواڑہ کی سرزمین شعراء کی زمین ہے یہاں ڈرامہ نگاری پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ عزیز احمد، رفیعہ سلطانہ اور وحیدہ نسیم نے افسانہ نگاری کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ ان تینوں میں سے عزیز احمد اور وحیدہ نسیم پاکستان چلے گئے۔ رفیعہ سلطانہ حیدرآباد چلی گئیں۔ وہاں جا کر انھوں نے کئی مشہور ڈرامے لکھے جن میں 'بھاگ متی' اور 'مرزا غالب' قابل ذکر ہیں۔ پولیس ایکشن سے پہلے اورنگ آباد میں ایک گروپ تیار ہوا۔ قاضی سعید الدین، قاضی معین الدین اور قاضی شرف الدین، یہ تینوں بھائی اس گروپ کے اراکین تھے۔ ان لوگوں نے آغا حشر کاشمیری کے کئی ڈرامے کیے۔ جیسے کہ 'فیشن ایبل وائف'، 'لیلیٰ مجنوں' اور 'رستم سہراب' وغیرہ۔ قاضی برادران کو کافی شہرت ملی۔ ان کے ڈرامے تمام لوگ پسند کرنے لگے۔ یہ اپنے کردار نہایت ہی محنت اور عمدگی سے نبھاتے تھے۔ اس وقت خواتین صرف امور خانہ داری ہی میں مصروف رہتی تھیں۔ اداکاری کو معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے مستورات کے کردار بھی قاضی برادران بہ خوبی نبھاتے تھے۔ یہ تینوں چونکہ معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کے نسوانی کرداروں کو سخت ناپسند کیا گیا اور خاندان کے دباؤ کی وجہ سے ان بھائیوں نے ڈراموں سے ناطہ توڑ لیا۔

اس کے کچھ سالوں بعد شہر اورنگ آباد میں لاسلکی ریڈیو شروع کیا گیا۔ دور نظام میں اطلاعات و نشریات کے ساتھ ڈرامے کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا یہاں نشری اور اسٹیج ڈرامے بھی ہوئے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے ایک تمثیل ڈرامہ انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کی مدد سے کیا۔ اسے کافی لوگوں نے پسند کیا۔ حیدرآباد اور دور دراز سے لوگ اسے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ اسی دوران پروفیسر فاضل علی خان حیدرآباد سے اورنگ آباد تشریف لائے۔ وہ ایک اچھے ڈرامہ نگار اور تنقید نگار بھی تھے۔ انھوں نے کئی اسٹیج ڈرامے تحریر کیے۔ لاسلکی ریڈیو کے لیے بھی کئی ریڈیائی ڈرامے لکھے جو کافی شہرت کے حامل قرار پائے۔ ان کے ڈراموں کے پلاٹ اور کردار حاضرین کو پاگل بنا دینے کے لیے کافی تھے۔ سونے پر سہاگہ ان کی ناقدانہ بصیرت اور چٹکلوں کے مکالمے، ڈرامے کی کامیابی کے لیے ایک خاص فضا ہموار کرتے تھے۔ اسی دوران الیاس فرحت کے بڑے بھائی عباس اختر نے ایک ڈرامہ لکھا جس کا نام 'ٹوٹے خواب' تھا۔ جو بہت مشہور ہوا اور کئی سالوں تک چلتا رہا۔ لیکن بدقسمتی کہیے یا کچھ اور، چند سالوں تک ڈرامے کی یہ دنیا رک سی گئی۔ پھر رفعت نواز جیسا ڈرامہ نگار مرہٹواڑہ کی زمین پر نمودار ہوا۔ اس بار ڈراموں کا مرکز شہر اورنگ آباد کا سلطنہ کالج تھا۔ رفعت نواز نے یہاں کئی ڈرامے لکھے اور اسٹیج بھی کروائے۔ ان کے معاون ساتھیوں میں یوسف حامد اور قاضی معین جیسے قابل اداکار موجود تھے۔ ان کے ڈراموں نے سالوں تک لوگ محظوظ ہوتے رہے۔ رشید انور کے ذریعے پیش کیا گیا ڈرامہ 'مجھے آواز دو' بہت مشہور ہوا۔ جسے سلطنہ کالج کے طلبہ نے پیش کیا تھا۔ شہر اورنگ آباد کے گورنمنٹ کالج میں ڈاکٹر صفی الدین اور شیخ عصمت جاوید نے طبع زاد ڈرامے لکھے اور کئی انگریزی ڈراموں کا ترجمہ بھی کیا۔ ان ڈراموں کو دیکھنے کے لیے طلبہ اور طلبہ کے سرپرست امڈ پڑتے تھے۔ اسی دوران ڈاکٹر رفیق ذکریا نے مولانا آزاد کالج کا سنگ بنیاد رکھا۔ بس پھر کیا تھا اپنی مادری زبان کے آنچل میں خود کو سمونے کے لیے اردو کے چاہنے والے تیار بیٹھے تھے۔

پروفیسر عظیم بھوپالی نے یہاں کی آزاد فضا میں کھل کر اپنے قلم کا جادو دکھایا۔ انھوں نے کئی ڈرامے تحریر کیے اور اسٹیج بھی کیے۔ جیسے 'اندھیرے سے اجالے تک'، 'کرشن چندر کا 'دروازہ کھول دو' اور 'اخبار کا دفتر' وغیرہ۔ ان ڈراموں کو دیکھنے کے لیے پورا مرہٹواڑہ یکجا ہوتا تھا۔

ولی اور سراج کی سرزمین پر ایک سنہرے دور نے دستک دی۔ وہ یوم اور ماہ و سال تھا ۲۲ ستمبر ۱۹۷۷ء جب شہر اورنگ آباد میں آکاشوانی آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا۔ اور یہاں سے نشری ڈراموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ کئی طبع زاد ڈرامے لکھے گئے۔ عصمت جاوید اور صفی الدین نے سماج کے کئی سلگتے مسائل کو اپنے ڈراموں کے ذریعے پیش کیا اور ان سے باہر نکلنے کا راستہ بھی دکھایا۔ اسی وقت ایک پرائمری مدرس کی نظر ریڈیو اسٹیشن پر پڑی۔ اس نے سوچا مدرسی سے زیادہ اپنی آواز کا جادو یہاں چلایا جا سکتا ہے۔ اور وہ اپنے کالج کے سنہرے دنوں میں اسٹیج پر بہترین اداکاری کے ساتھ لوگوں پر چھا جاتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مدرسی ملازمت ترک کر کے ریڈیو اسٹیشن سے اپنا ناطہ جوڑا۔ آواز کے شہنشاہ تو وہ تھے ہی۔ یہاں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو کی آوازیں گھر گھر سنائی دیتی تھیں اور قدم قدم پر ریڈیو آرٹسٹوں کی تعریف ہوا کرتی تھی۔ اس خوب صورت شکل آواز نے بہ حیثیت ڈرامہ آرٹسٹ آکاشوانی میں قدم رکھا۔ پہلے جز وقتی اور پھر بعد میں مستقلاً وہیں اپنا ڈیرہ جما لیا۔ وہ دل کش شکل آواز تھی میرے استاد، میرے گورو آرٹسٹ اور مہربان و مشفق جناب

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

اردو دُنیا

دوردرشن مدھیہ پردیش سے اردو خبروں کی نشریات شروع

جوائنٹ ڈائرکٹر اور نیوز اڈیٹر منیش گوتم نے شعبۂ اردو کا افتتاح کیا

بھوپال (۲۷ ستمبر)۔ اردو خبروں کی نشریات کے ساتھ ہی دوردرشن مدھیہ پردیش کی نشریات میں آج بجے کی شام نئے باب کا اضافہ ہوا۔ دوردرشن بھوپال مرکز سے بجنے کی شام ۶:۰۰ بجے پر اردو خبروں کی اولین نشریات دہلی سے تشریف لائے نیوز ریڈر محمد نعمان نے کی۔

اس سے پہلے بھوپال دوردرشن مرکز کے جوائنٹ ڈائرکٹر اور نیوز اڈیٹر منیش گوتم نے مرکز میں شعبۂ اردو کا شمع روشن کرکے افتتاح کیا۔ اس موقع پر مرکز کی ڈائرکٹر برائے انجینئرنگ محترمہ نوتیت کور، اسسٹنٹ ڈائرکٹر برائے نیوز اکمل حمید، اردو نیوز پروڈیوسر ساجد رضوی، صلاح کار خورشید اختر کے علاوہ دوردرشن کے دیگر افسران و عملہ بھی موجود تھے۔

اس موقع پر جناب منیش گوتم نے تمام حاضرین کو اردو خبروں کی نشریات شروع ہونے پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ دوردرشن مدھیہ پردیش کے 21 سالوں کے سفر میں آج اردو خبروں کی نشریات کے ساتھ ہی نئی تاریخ رقم ہو رہی ہے۔ انھوں نے اردو خبروں کی نشریات کے سلسلے میں دوردرشن کے اسٹاف اور شعبۂ اردو سے وابستہ بھی لوگوں کی کاوشوں کو سراہا۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے اردو خبروں کے بعد شعبۂ اردو کو مزید وسعت دینے کی تجویز ہیڈکوارٹر کو بھیجی ہے اور امید ہے کہ مستقبل قریب میں ہم اردو فیچر پروگرام بھی نشر کریں گے۔ (ندیم۔ بھوپال)

محکمۂ تعلیم کے پاس اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے اردو کی کتابیں نہیں

شاہجہاں پور (۱۳ ستمبر)۔ ریاست میں اردو کو اگرچہ دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے مگر محکمۂ بیسک تعلیم اردو زبان کے تئیں اپنا حسب روایہ اختیار کرنے سے باز نہیں آرہا ہے۔ نیا تعلیمی سیشن شروع ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں مگر اردو پڑھنے والے طلبہ کے لیے محکمہ کے پاس اردو کی کتابیں مہیا نہیں ہیں، جس سے اردو کے طلبہ اردو مضمون پڑھنے سے محروم ہیں۔ جب ان طلبہ کے پاس کتابیں ہی نہیں ہیں تو امتحان کا مطلب ہی کیا۔ اردو طلبہ کے لیے اردو کتابوں کی دستیابی ایک بڑا سوال بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں نہ تو محکمہ کے ذمہ دار سنجیدہ ہیں اور نہ ہی خود اردو اساتذہ۔ کہنے کو اردو اساتذہ ویلفیئر ایسوسی ایشن اردو زبان کے فروغ اور اردو اساتذہ کے مسائل کے تئیں سنجیدہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے جس کی وجہ سے بیسک تعلیم میں اردو کو نہ تو فروغ حاصل ہے اور نہ ہی وقار۔ نصاب میں شامل ہونے کے باوجود بھی اردو کی درسی کتابوں کا مہیا نہ ہونا اردو زبان کے ساتھ زیادتی ہے۔ ضلع میں پرائمری اور جونیئر ہائی اسکولوں میں ہزاروں مسلم طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان کی مادری زبان اردو ہے۔ دیگر مضامین کے ساتھ مسلم طلبہ عام طور سے مضمون اردو لیتے ہیں، مگر محکمۂ بیسک تعلیم مسلم طلبہ کے لیے اردو کی کتابیں مہیا نہیں کراتا ہے۔ متعدد مرتبہ اس جانب توجہ مبذول کرانے کے باوجود محکمہ کوئی سنجیدگی نہیں دکھاتا ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو کے فروغ کے لیے متھلا یونیورسٹی میں مولانا آزاد چیئر بحال ہوگی

دربھنگہ، بہار (۱۶ ستمبر)۔ للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے تحت ۱۹۹۶ میں قائم کیے گئے مولانا آزاد چیئر کو دوبارہ بحال کیا جائے گا تاکہ اردو زبان و ادب کی ترقی ہو سکے اور ماہرین کو مدعو کرکے سیمینار اور سمپوزیم کا انعقاد کیا جائے گا۔ یہ باتیں للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سریندر موہن جھا نے روزنامہ راشٹریہ سہارا کے دربھنگہ ضلع نمائندہ کو بتایا۔

وائس چانسلر کو جب نمائندہ نے یہ جانکاری فراہم کرائی کہ ۲۰۰۲-۲۰۰۳ کے درمیان ڈاکٹر مشتاق احمد (پرنسپل سی ایم کالج دربھنگہ) کی ڈائرکٹرشپ میں مولانا آزاد چیئر کے زیر اہتمام این سی پی یو ایل کے تعاون سے قومی سیمینار بھی منعقد کیے گئے اور چیئر کے فنڈ میں دو لاکھ روپے بھی جمع کرائے گئے، لیکن ۲۰۰۳ کے بعد مذکورہ چیئر غیر متحرک ہوگیا۔ اس پر وائس چانسلر نے فوری طور سے رجسٹرار سے رابطہ کیا اور ڈاکٹر مشتاق احمد کو دوبارہ مولانا آزاد چیئر کے ڈائرکٹر کی ذمہ داری سونپے جانے کی جانب سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا اور ممکن ہے کہ عنقریب ہی وائس چانسلر اس کی ذمہ داری مشتاق احمد کو سونپ دیں گے۔ وائس چانسلر کی خواہش ہے کہ چیئر کے زیر اہتمام اردو کے فروغ کے لیے کام کیے جائیں۔ متھلا یونیورسٹی کے تحت سی ایم سائنس کالج (دربھنگہ)، ایم کے کالج اور مارواڑی کالج سمیت دربھنگہ، مدھوبنی، سمستی پور اور بیگو سرائے کے سات عدد کالجوں میں اردو اساتذہ کے عہدے منظور نہیں ہوتے اور پڑھائی کا کوئی نظم نہیں ہونے کے متعلق پوچھے گئے سوال کے جواب میں کہا کہ کالجوں کے پرنسپل اس کی تجویز بھیجیں گے تو اس پر سنجیدگی سے غور کرکے حکومت سے رجوع کیا جائے گا۔ (راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

ڈی ایس سی ۲۰۰۸ میں اردو میڈیم اساتذہ کی اسامیوں پر عدم تقررات

حیدرآباد (۲۶ ستمبر)۔ ڈی ایس سی ۲۰۰۸ کی اردو میڈیم کی اسکول اسسٹنٹ کی اسامیوں پر تاحال تقررات عمل میں نہیں لائے گئے اور اس سلسلے میں کئی اردو انجمنوں نے بھی نمائندگی کی اور ہمارے چیف منسٹر نے ذمہ دار وزرا کو احکام جاری کرنے کا حکم بھی دیا لیکن اس کے باوجود بھی اردو میڈیم کی اسامیوں کے متعلق سے سوتیلا سلوک کیا جارہا ہے جس سے اردو میڈیم کی تعلیم متاثر ہو رہی ہے۔ مدارس میں پڑھانے کے لیے مدرس نہ ہونے تو اسکول میں طلبہ و طالبات میں تعلیم سے عدم دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ طلبہ کے سرپرستوں نے بھی بارہا حکومت پر زور دے کر نمائندگی کی، اس کے باوجود بھی مدارس میں کئی اسامیاں خالی ہیں، اس کی اہم وجہ حکومت کا سوتیلا سلوک ہے۔ چیف منسٹر سے التماس ہے کہ وہ جلد از جلد اس مسئلے کی یکسوئی کے لیے اعلیٰ عہدیداروں کو حکم دیں۔ (اعتماد۔ حیدرآباد)

مشرقی دہلی کارپوریشن نے اپنے قیام کے بعد سے کسی بھی اردو ٹیچر کا تقرر نہیں کیا

نئی دہلی (۱۲ ستمبر)۔ مشرقی دہلی کارپوریشن کی اگر بات کریں تو یہاں تقریباً 332 اردو اساتذہ کی کمی ہے۔ قابل ذکر ہے کہ جب سے کارپوریشن کی تقسیم ہوئی اور مشرقی دہلی کارپوریشن وجود میں آیا تب سے نہ تو اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے کوئی اشتہار نکالا گیا اور نہ ہی کسی کا تقرر ہوا، جب کہ اس سے قبل ہر سال ضرورت کے مطابق اردو اساتذہ کی تقرری ہوتی تھی۔ تاہم آج کل ہندی کے اساتذہ کی تقرری جاری ہے۔ کارپوریشن نے دکھاوے کے لیے کچھ مسلم ٹیچر کی تقرری کی ہے، مگر ان میں سے بیشتر کو اردو نہیں آتی۔

جب سے کارپوریشن کے اس زون کا وجود ہوا ہے تب سے پورے زون میں کسی بھی اردو ٹیچر کا تقرر نہیں کیا گیا۔ اس کارپوریشن کے تحت شمالی شاہدرہ اور جنوبی شاہدرہ زون آتے ہیں۔ یہاں کارپوریشن کے کل 390 اسکول ہیں جن میں سے 23 اسکول اردو میڈیم ہیں۔ ان اسکولوں میں کل 245 اردو کے اساتذہ ہیں جن میں سے 97 مستقل اور 148 کانٹریکٹ کی بنیاد پر کام کر رہے ہیں۔ ان اسکولوں میں مزید 112 اردو اساتذہ کی کمی ہے اور اس کمی کی وجہ سے اردو پڑھنے والے طلبہ کو غیر معمولی پریشانیوں کا سامنا ہے۔ اس کارپوریشن کو اردو کی کتنی فکر ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہو جاتا ہے کہ گزشتہ ۲۷ راگست کو تقریباً 600 اساتذہ کی تقرری کے لیے اشتہار نکالا گیا تھا اور ان میں سے ایک بھی اردو کے ٹیچر کی اسامی نہیں تھی۔ بدنامی سے بچنے کے لیے کارپوریشن نے کچھ مسلم ٹیچروں کی تقرری بطور ہندی ٹیچر تو کیا مگر ان میں سے کافی لوگ اردو سے ناآشنا ہیں۔ ۱۰ ستمبر کو ان لوگوں کو اپائنٹمنٹ لیٹر دیا گیا جس میں ہندی ٹیچر درج ہے۔ مشرقی دہلی کارپوریشن کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے اردو داں حضرات نے کئی مکتوب ارسال کیے اور کئی وفود بھی متعلقہ افسران سے جاکر ملے مگر آج تک کارپوریشن نے اپنی ذہنیت کو نہیں بدلا۔ اس سلسلے میں نمائندے نے کارپوریشن کے ایجوکیشن ڈائرکٹر سے بات کرنی چاہی، مگر انھوں نے فون نہیں اٹھایا۔

دوسری جانب کونڈلی سے کونسلر عشرت جہاں کا کہنا ہے کہ اردو ٹیچر اپلائی بھی کر رہے ہیں، کافی پریشان بھی ہیں اور اسامیاں بھی خالی پڑی ہیں۔ ہم اس سلسلے میں ایوان کی میٹنگ میں آواز اٹھائیں گے اور ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں جو ہمارے ممبران ہیں ان سے بھی بات کریں گے۔ آپ بہت جلد دیکھیں گے کہ اس کے مثبت نتائج سامنے آئیں گے۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو کے نفاذ کے سلسلے میں ایک وفد گارڈن ریچ میونسپلٹی چیئرمین سے ملا

گارڈن ریچ، مغربی بنگال۔ معروف سماجی کارکن طاہر علی صدیقی کی سربراہی میں اردو والوں کا ایک پانچ رکنی وفد جس میں حاجی حیات احمد عرش، پرویز احمد انجینئر، محمد سلیم اور ریاست علی بھی شامل تھے، گارڈن ریچ میونسپلٹی کے چیئرمین تمال دے سے ان کے بورڈ میٹنگ روم میں ملا اور میونسپلٹی دفاتر اور گارڈن ریچ علاقے میں اردو کا نفاذ و عمل کس طرح ہو اس پر ان سے بات چیت ہوئی جس میں نئے تعمیر شدہ شانتی گھٹک میموریل اردو ہائی اسکول میں پڑھائی شروع کرنے سے متعلق بھی غور و خوض کیا گیا۔ حاجی حیات احمد عرش نے راستوں، سڑکوں کے نام اردو میں بھی لکھنے، پیدائش و موت کا سرٹیفکٹ اردو میں جاری کرنے، عرض داشتوں، دستاویزوں اور دیگر کاغذات اردو زبان میں لیے اور ان کے جوابات دیے، نوٹس بھی اردو میں مہیا کرانے کے علاوہ اعلانات کی تشہیر اردو زبان میں کرانے کی بات کہی۔ اس کے علاوہ مرحبہ دروازے سے اتحاد کا نکاس نئے تعمیر شدہ شانتی گھٹک میموریل اردو ہائی اسکول میں آئندہ تعلیمی سیشن ۲۰۱۴ سے اس میں پڑھائی شروع کرنے کی بات بھی کہی گئی۔ چیئرمین نے وفد کی باتوں کو سننے کے بعد کہا کہ اسکول کا تعلیمی سیشن ۲۰۱۴ کے بجائے ۲۰۱۵ سے شروع ہوگا۔ یہ کہنے پر کہ کم مشاہرے پر ٹیچر مہیا کراکر اور ایک کلاس ہی قائم کرکے داخلے کے لیے آغاز ہو جائے تو اچھا رہے گا۔ چیئرمین موصوف نے کہا کہ اس معاملے کو بورڈ میٹنگ میں پیش کرکے صلاح و مشورہ کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے سڑکوں، راستوں کے نام دیگر زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی لکھنے اور انھیں آویزاں کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا جو بھی معاملہ ہوگا ہم ضرور آپ لوگوں سے صلاح و مشورہ کرتے رہیں گے۔ واضح ہو کہ انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ نے اردو کے نفاذ کے لیے بلدیہ کے نام مراسلہ بھیجا تھا جس کا جواب آنے پر یہ وفد چیئرمین سے ملا تھا۔ (اخبار مشرق۔ کلکتہ)

اردو میڈیم اسکولوں سے مراٹھی کے اساتذہ کو ہٹانے کی ٹی ایم سی کو ہدایت

ممبئی۔ تھانے میونسپل کارپوریشن (ٹی ایم سی) کی جانب سے اردو میونسپل اسکولوں میں مراٹھی میونسپل اسکولوں کے اساتذہ کے تبادلے کے معاملے میں ۱۳ ر ستمبر کو وزیر مملکت برائے اسکولی تعلیم فوزیہ خاں نے منترالیہ میں ایک میٹنگ منعقد کی جس میں تھانے میونسپل کارپوریشن اور ریاست کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے متعلقہ افسران کو طلب کیا گیا اور انھیں تھانے کے اردو میونسپل اسکولوں سے مراٹھی میڈیم کے اساتذہ کو فوری طور پر ہٹانے کی ہدایت دی گئی۔

غور طلب ہے کہ تھانے میونسپل کارپوریشن (ٹی ایم سی) نے مراٹھی میڈیم کے بارہ اساتذہ جو اردو سے نابلد ہیں، کا اردو میڈیم اسکولوں میں تبادلہ کیا ہے۔ اس خبر کے منظر عام پر آنے کے بعد متعدد تنظیموں نے وزیر مملکت برائے اسکولی تعلیم سے رابطہ قائم کیا اور تھانے میونسپل کارپوریشن کی جانب سے اردو میڈیم کے ساتھ سوتیلے سلوک سے آگاہ کروایا۔

اس تعلق سے جب فوزیہ خاں سے رابطہ قائم کیا گیا تو انھوں نے بتایا کہ ٹی ایم سی کی جانب سے اردو میونسپل اسکولوں میں مراٹھی میڈیم کے اساتذہ کے تبادلے کی تصدیق ہونے پر اس تعلق سے میں نے ایک میٹنگ منعقد کی جس میں تھانے میونسپل کارپوریشن کے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے افسران کو طلب کر کے انھیں ہدایت دی گئی ہے کہ اردو میڈیم کے اسکولوں میں مراٹھی میڈیم کے جتنے اساتذہ کا ٹرانسفر کیا گیا ہے انھیں فوراً ہٹایا جائے اور اس تعلق سے ٹی ایم سی کے ایوان میں فوراً تجویز پیش کر کے ضروری کارروائی کی جائے۔ یہ سراسر غلط طریقہ ہے کہ اردو اساتذہ کی کمی کو دور کرنے کے لیے مراٹھی میڈیم کے اساتذہ کا تبادلہ اردو میڈیم کے اسکولوں میں کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ تھانے کے شہری انتظامیہ کو یہ ہدایت بھی دی گئی ہے کہ وہ اردو میڈیم کے ٹیچروں کی خالی اسامیوں کو پر کرنے کی کارروائی بھی شروع کرے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ چوں کہ مرکزی حکومت کی جانب سے اساتذہ کی بھرتی کے لیے ٹی ای ٹی لازمی قرار دیا گیا ہے اور یہ نومبر میں ہوں گے اس لیے مذکورہ ٹیسٹ کے بعد ہی اردو میڈیم کے اساتذہ کی تقرری متوقع ہے۔

(سیرت۔ ممبئی)

جامعہ اردو علی گڑھ میں مذاکرہ

"مولانا ابوالکلام آزاد اور فروغ اردو ادب"

علی گڑھ۔ گزشتہ دنوں جامعہ اردو علی گڑھ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی علمی و ادبی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنے کے مقصد سے ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ جامعہ اردو کے طویل ہفت روزہ سالانہ پروگرام کے آخری دو دن علمی مذاکرے کے لیے مختص کیے گئے، پہلے دن کی محفل تقاریر سے مزین تھی، جس کے مہمان خصوصی مولانا آزاد کے خانوادے سے تعلق رکھنے والے مشہور قلم کار فیروز بخت احمد تھے۔ انھوں نے اپنی فکر انگیز تقریر میں مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ شام کو محفل مشاعرہ کی شمع بھی انھوں نے روشن کی، جس میں موقر شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔

دوسرے دن کا مذاکرہ اہم علمی و ادبی مقالوں کو محیط تھا، جس میں دو پر مغز مقالے حاصل بزم تھے۔ پہلا مقالہ معروف ادیب و صحافی ڈاکٹر مظفر حسین سید کا تھا، جس کا عنوان تھا 'مولانا ابوالکلام آزاد اور اردو کا تحفظ'۔ مقالہ نگار نے دعویٰ کیا کہ آزاد ہندستان میں آج اردو کا وجود مولانا آزاد کی سرپرستی اور عملی کاوشوں کا رہین منت ہے۔ انھوں نے صراحت کی کہ مولانا نے بہ حیثیت زبان اردو کی بقا اور اس کے تحفظ کا عزم کیا۔ مولانا آزاد نے تمام اردو اداروں کی حمایت کا بندوبست بھی کیا اور بالخصوص انجمن ترقی اردو (ہند) کے تحفظ، بقا اور فروغ کے لیے مستحکم اقدام کیے، جس کے نتیجے میں آج انجمن نہ صرف زندہ، فعال اور سرگرم ہے بلکہ اس کی ایک نمایاں اور قائدانہ حیثیت ہے۔

دوسرا اہم مقالہ محمد فاروق (برقی) کا تھا، انھوں نے اپنے مقالے میں مولانا آزاد کی علمی و ادبی خدمات کا احاطہ کیا اور بالخصوص ان کی صحافتی خدمات پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ انھوں نے مولانا آزاد کو ایک عظیم مفکر و جید اہل قلم کی حیثیت سے خراج تحسین پیش کیا۔

اس موقعے پر جامعہ اردو کے افسر بکار خاص فرحت علی خاں نے مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا اور جامعہ اردو کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ مذاکرے کے روح رواں جسیم محمد نے معزز مہمانوں کی تہنیت کی اور مولانا آزاد جیسی شخصیات کے احترام میں اس طرح کے پروگرام مسلسل کرتے رہنے کے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر رضاء اللہ شروانی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض مساعد قدوائی نے انجام دیے۔

(باب الدین حقانی)

اردو اساتذہ کی تقرری میں رخنہ متعصب نوکر شاہی کا نتیجہ

پردیش کانگریس کے دفتر میں دھوم دھام سے قائم کیا گیا 'اردو میڈیا سیل' کیوں بند ہوا؟

نئی دہلی (۱۸ ر ستمبر)۔ دہلی میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا دعویٰ کرنے اور اس کا کریڈٹ بھی حاصل کرنے والی کانگریس کی سرکار میں اردو کی جو بدحالی ہوئی ہے اسے کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ سرکاری کاغذات میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ پانے والی اردو سب سے زیادہ عتاب کا شکار ہے۔ سب سے پہلے ہم دہلی سرکار کے بیا کوارٹر دہلی سکریٹریٹ کی ہی بات کرتے ہیں۔ یہاں صرف میڈیا روم میں تو اردو کے اخبارات مل جائیں گے لیکن ان اخبارات کی کوئی کلپنگ سرکار کے ذریعے نہیں کرائی جاتی۔ ان اردو اخبارات میں کیا کچھ شائع ہوتا ہے اور مسلمانوں کی اپنی سرکار، وزرا اور سرکاری افسران کے تعلق سے کیا رائے ہے اس کا پتا وزرا اور افسران کو قطعی نہیں ہوتا۔ وزیر اعلا سے لے کر کسی بھی وزیر کے کمرے کے باہر ان کے نام کی کوئی تختی اردو میں نہیں ہے۔ اردو میں لکھی گئی کسی بھی درخواست پر دہلی سکریٹریٹ میں کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور یہ درخواستیں یا تو فائلوں میں دبی رہتی ہیں یا پھر کوڑے دان کی زینت بنتی ہیں۔

دہلی سکریٹریٹ کے بعد آیئے بات کرتے ہیں پردیش کانگریس کمیٹی کے دفتر راجیو بھون کی جہاں صدر پردیش کانگریس کا عہدہ سنبھالنے کے بعد جے پرکاش اگروال نے بڑی دھوم دھام سے دفتر میں اردو میڈیا سیل قائم کیا تھا۔ اس اردو میڈیا سیل نے کچھ دن تک کام کیا اور اردو اخبارات کو اردو میں پریس ریلیز اور کچھ دیگر معلومات فراہم کرائیں لیکن پھر اچانک ہی یہ سلسلہ ختم سا ہو گیا اور پھر بالکل ختم ہو گیا۔ جب پردیش صدر کی توجہ اس جانب دلائی گئی تو ان کا کہنا تھا کہ آپریٹر چھٹی پر گیا ہے۔ بعد میں بتایا گیا کہ وہ کام چھوڑ گیا۔ جب کہا گیا کہ بیمار کو بھیجے تو کہا گیا کہ مل نہیں رہا اور پردیش کانگریس کو ایک عدد اردو کمپیوٹر آپریٹر مترجم آج تک نہیں ملا، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ آپ آج ایک اسامی کا اشتہار دیجیے کل پچاس لوگ لائن لگائے کھڑے ہوں گے۔

دہلی سرکار کے محکمۂ اطلاعات میں بھی یہی حالت ہے۔ یہاں برسوں سے خالی پڑی اردو مترجم کی اسامی آج تک پر نہیں ہو سکی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ متعصب ذہنوں نے اس اسامی کو شیڈول کاسٹ کے لیے ریزرو کر دیا۔ اب ایس سی زمرے میں اردو جاننے والا نوجوان کہاں سے ملے گا ظاہر ہے کہ نہ ملے گا اور نہ یہ اسامی کبھی پر ہوگی۔ اس کے علاوہ دہلی کے سرکاری اسکول ہوں یا میونسپل کارپوریشن کے اسکول، کہیں بھی اردو اساتذہ کی تقرری پوری نہیں ہے۔ جو اردو استاد ریٹائر ہو جاتا ہے اس کی جگہ دہلی سرکار کا محکمۂ تعلیم ایس ایس ایس بی سے نئے اساتذہ کا تقرر نہیں کرتا۔ دہلی کے کسی بھی اسکول میں چلے جایئے یہی حالت ہے۔ دوسری جانب سنسکرت پڑھنے والے بچے نہیں ہیں لیکن سنسکرت کے اساتذہ خالی بیٹھے رہتے ہیں اور ان کی تقرری بھی ہوتی رہتی ہے۔ صدقہ یہ ہے کہ اردو کے اساتذہ کی تقرری کے لیے اردو والوں کو عدالت کا سہارا لینا پڑتا ہے اور جب عدالت حکم صادر کر دیتی ہے کہ اردو اساتذہ کا تقرر کیا جائے تب بھی نوکر شاہی اردو اساتذہ کی تقرریوں کی راہ میں ایک کے بعد ایک رخنہ ڈالتی رہتی ہے۔ نتیجے کے طور پر وزیر اعلا اور وزیر تعلیم کی تمام تر کوششوں کے باوجود دہلی کے اسکولوں کے لیے 200 اردو اساتذہ کا تقرر اب تک نہیں ہو سکا اور اب شاید ممکن بھی نہیں ہے کیوں کہ آئندہ پانچ نومبر میں ہی دہلی اسمبلی کے الیکشن کا نوٹیفکیشن جاری ہو جانے کی امید ہے۔ اس کے بعد ان اساتذہ کی تقرری کم سے کم اگلی سرکار کی تشکیل تک تو سرد خانے میں چلی ہی جائے گی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

حیدرآباد کرناٹک کے اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ

گلبرگہ (۲۹ ر ستمبر)۔ کانگریس لیڈر عبدالقدیر چودھری اور جناب نذیر احمد قادری نے اپنے مشترکہ بیان میں چیف منسٹر سدارامیا سے اپیل کی ہے کہ حیدرآباد کرناٹک کے اضلاع میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے کر اردو زبان کے ساتھ انصاف کر کے لاکھوں اردو داں عوام کے دیرینہ مطالبے کی یکسوئی کریں۔ انھوں نے کہا کہ حیدرآباد کرناٹک علاقے میں عوام کی اکثریت بلالحاظ مذہب و ملت اردو زبان بولتی اور سمجھتی ہے پھر مزید یہ کہ ۱۹۴۸ تک اردو ہی علاقے میں سرکاری زبان تھی، لہٰذا حیدرآباد کرناٹک کے علاقے کے اضلاع میں اردو زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے اقدام عمل میں لائے جائیں۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

اردو اسکولوں کا معیار بہتر کرنے کے لیے ضروری اقدام کیے جائیں

بیجاپور، کرناٹک (۲۳ ر ستمبر)۔ شہر بیجاپور کے رکن اسمبلی ڈاکٹر مقبول باغوان نے ریاستی وزیر برائے پرائمری تعلیم سے گزارش کی کہ ریاست میں اردو اسکولوں کے تعلیمی معیار کو بہتر کرنے اور ڈراپ آوٹ سے نجات دلانے کے لیے موثر اقدام کیے جائیں۔ یہاں ضلع پنچایت کانفرنس ہال میں ریاستی وزیر برائے پرائمری تعلیم شری کے رتناکر کی صدارت میں منعقد ایک اجلاس میں انھوں نے یہ بات کہی۔ انھوں نے وزیر موصوف کے علم میں یہ بات بھی لائی کہ فزیکل ایجوکیشن کا نصاب اردو میں ہے، مگر سرکاری اردو اسکولوں میں اکثر فزیکل ٹیچرز غیر اردو داں ہیں لہٰذا انھوں نے مطالبہ کیا کہ سرکاری اردو اسکولوں میں اردو پڑھنے لکھنے والے فزیکل ٹیچرس کے تقررات عمل میں لائے جائیں۔ اجلاس میں ضلع کے دیگر ٹیچرس نے تعلیمی مسائل کے حل کے لیے کئی مشورے دیے۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے وزیر موصوف نے ڈاکٹر مقبول باغوان کے مذکورہ مطالبے پر عمل کرنے کا یقین دلایا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ضلع میں مزید سرکاری ہائی اسکول اور جونیئر کالج شروع کرتے ہوئے سائنس، انگریزی اور حساب جیسے مضامین کے ٹیچروں کی بھرتی کو ترجیح دی جائے گی۔

(سالار۔ بنگلور)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : اوراک سعی
(تنقیدی مضامین)
مصنف : ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
ضخامت : ۲۲۴ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتہ : ساحل کمپیوٹرس، حیدری روڈ، مومن پورہ، ناگپور-۴۴۰۰۱۸
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepak.budki@gmail.com

'اوراک سعی' ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کے اٹھارہ تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب ہے جس میں مختلف شعرا اور نثر نگاروں کی شخصیت اور فن کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی ترتیب ڈاکٹر ساحل کے بیٹے محمد رفیع الدین اور بہو، شبانہ پروین نے دی ہے۔ ڈاکٹر ساحل تنقید کو ایک عمل اور آزاد صنف مانتے ہیں جس کے تحت نقاد اپنے خیالات کے وجدان و شعور کے دائرے میں قید رہ کر بے محابا اظہار کرتا ہے اور انجام کار فن کار کی شخصیت اور فن کا تعین کرتا ہے۔ اسی دائرے میں رہ کر انھوں نے مختلف شعرا و ادبا کے فکر و نظریے کا تجزیہ کیا ہے۔ محمد شرف الدین اردو، فارسی اور عربی میں ایم اے کرکے دو زبانوں میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکے ہیں۔ ادبی تحقیق، تاریخ، تنقید، تعلیم، تعلیم وغیرہ کے حوالے سے ان کی ۲۹ سے زائد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

زیر نظر کتاب میں اردو شاعری میں خدا کے تصور، نعتیہ کلام اور اخلاقیات کے حوالے سے تین مضامین شامل ہیں۔ اقبال کی شاعری کے حوالے سے پانچ مضامین ہیں جو ان کے نظریہ حرکت و عمل، تعلیم، قومیت و وطنیت اور فنون لطیفہ اور عورت کے بارے میں ان کے خیالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اسی طرح مولانا آزاد کی مذہبی فکر اور نظریہ تعلیم پر بھی دو مضامین شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ظفر کی یاسیت، شارق ایرانی، عزیز جاوید، ساقی جاوید، یونس قنوجی اور میر ہاشم کی شاعری سے متعلق چھ مضامین بھی شامل اشاعت ہیں۔ جہاں تک نثر کا تعلق ہے۔ انھوں نے پریم چند کی افسانہ نگاری اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے ادبی ذوق پر بھی مضامین قلم بند کیے ہیں۔

ڈاکٹر ساحل نے کئی شاعروں کے ایسے اشعار کے نشان دہی کی ہے جن میں انھوں نے حقیقت کی رو میں آکر وحدت الوجود پر انگلیاں اٹھائی ہیں۔ ان شعرا میں اقبال، جوش، حفیظ جالندھری، اسلم فرخی بدایونی، عندلیب شادانی، عدم لاہوری، اختر رشیدی، قیصر الجعفری، ظفر گورکھپوری، بشیر بدر، ناصر کاظمی، مظفر حنفی، ندا فاضلی وغیرہ شامل ہیں۔ نعت کے حوالے سے تنقید نگار نے جہاں کئی شاعروں کے نعتیہ کلام کو پسند کیا ہے، وہیں چند ایک شعرا کی لغزشوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:
"اس لیے نعت میں انھی چیزوں کو اولیت دینی چاہیے اور اس کا وہی لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ ہونا چاہیے جو عبداللہ بن رواحہ، مولانا حالی، جوش ملیح آبادی، علامہ شارق ایرایانی، یا محسن حنفی کی نعتوں میں ملتا ہے۔ یہی سچی اور حقیقی نعتیں ہیں اور یہی نعت گوئی کے مقصد کو بھی پورا کرتی ہیں۔" اخلاقی اقدار کو مضمون نگار اسلام کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور قناعت، استغنا، توکل، رضا، خاکساری، رزق حلال، سخاوت اور نیک عمل وغیرہ کو ضروری سمجھتے ہیں جب کہ حرص و ہوس، غرور، کینہ وغیرہ کو سفلی کردار کی پہچان مانتے ہیں۔ بہ قول ڈاکٹر ساحل "اردو کے شعرا نے اخلاقی مضامین کو خوب صورت تخلیقی پیکر عطا کیا ہے۔ انھوں نے سلیس، سہل، شیریں اور بلیغ انداز میں اخلاقی مسائل کو بیان کیا ہے۔" نقاد نے پسندیدہ شعرا کے منتخب اشعار بھی اپنے مضمون میں درج کیے ہیں۔

'اقبال کا نظریہ حرکت و عمل' میں اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے ذریعے ڈاکٹر ساحل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال جمود کو موت اور حرکت و عمل کو زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ 'اقبال اور فنون لطیفہ' میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ "اقبال نے آرٹسٹ کو متنبہ کیا ہے کہ نگاہ شوق، جذبہ عشق، جوہر خودی، خون جگر اور سوز دروں کے بغیر اچھے اور سچے فن کی ہرگز تخلیق نہیں ہو سکتی۔" وہ فن میں جلال اور جمال اور شاعری میں حیات ابدی کے پیغام کو ضروری سمجھتے ہیں۔ 'اقبال کا نظریہ تعلیم' مروجہ تعلیم کو کسوٹی پر رکھ کر اس کی کمیوں کی جانب اشارہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ نظام تعلیم ذہنی تربیت کے ساتھ ساتھ دل کی تربیت کا بھی خیال رکھے۔ 'اقبال کا نظریہ قومیت و وطنیت' حب الوطنی کا اعتراف تو کرتا ہے اور سرحدوں کو پھلانگ کر اسلامی اخوت کا درس دیتا ہے۔ اسی طرح مضمون 'اقبال اور عورت' میں بھی اقبال عورت کو اسلامی معاشرے کے حدود میں رہ کر اس کے حق اور فرائض کی نشان دہی کرتا ہے۔

مولانا آزاد بھی مشہور اسلامی دانشور اور سیاست داں تھے جو پوری عمر ہندوستان کے مسلمانوں کی رہبری کرنے میں لگے رہے۔ ڈاکٹر ساحل نے 'مولانا آزاد کی مذہبی فکر' اور 'مولانا آزاد کا نظریہ تعلیم' کے تحت ان کی سوچ و فکر اور تعلیم کی جانب ان کے رویے، خاص کر جب وہ ملک کے وزیر تعلیم بھی رہے، پر روشنی ڈالی ہے۔ نثر نگاروں میں تنقید نگار نے پریم چند کی افسانہ نگاری پر قلم اٹھایا ہے اور ان کے جذبہ حب الوطنی، انسانیت نوازی، سماجی شعور اور غریب کسانوں اور مزدوروں کی طرف داری کو مرکز کیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے 'ڈاکٹر ذاکر حسین کا ادبی ذوق' کے تحت بچوں کے لٹریچر سے ان کے خصوصی شغف کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

بہادر شاہ ظفر مغل خاندان کے آخری بادشاہ تھے جنھیں انگریزوں نے رنگون میں قید کرکے رکھ دیا۔ ان کی شاعری میں ذاتی کلفتوں اور مغلیہ سلطنت کے زوال کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ مضمون 'ظفر کی یاسیت' اسی سوز دروں کی شاعری کا تجزیہ کرتا ہے۔ ظفر کے علاوہ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے شارق ایرایانی، عزیز حامد مدنی، ساقی جاوید، یونس قنوجی اور میر ہاشم کی شاعری پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔ یہاں پر ان شاعروں کے نمونہ کلام پر اکتفا کرتا ہوں:

یہ کائنات وہ ہے جس کے گوشے گوشے میں
خدا بہت سے ملے، بندۂ خدا نہ ملا
(شارق ایرایانی)

بس ابھی بس اندھیرا ہی اندھیرا ہے ابھی
اک جہاں سوز جہالت کا بسیرا ہے ابھی
(عزیز مدنی)

کوئی مریم جو مسیحا کو جنم دیتی ہے
شہر کی رسم اسے دیدۂ تر دیتی ہے
(ساقی جاوید)

انھیں حاصل تھی ہاشم ساری دنیا
ہمارے پاس کیا تھا اک خدا تھا
(میر ہاشم)

جس ریش میں کم ہو چشتی اور تک سے بہائی ہو جنت
وہ ریش ہے لب ہاشوں کا بازار عجب سا لگتا ہے
(یونس قنوجی)

مختصر یہ کہ ڈاکٹر ساحل کی مذکورہ کتاب موجودہ زندگی کی اخلاقیات، نظام تعلیم اور وطن پرستی کی بازیابی، اقبال اور مولانا آزاد کے نظریات کو سمجھنے اور دیگر شعرا کی شاعری کے ادراک میں مدد کرتی ہے۔ امید ہے اردو حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوگی۔

●●●

بقیہ: مرہٹواڑہ میں اردو ڈرامہ

صفحہ ۳ سے آگے

نور الحسنین صاحب کی۔ بچپن ہی سے انھیں اداکاری اور ڈرامہ نگاری کا شوق تھا۔ ایک ریڈیو اناؤنسر کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے ایک نئے سفر کے ساتھ ایک نئے جہان میں نئی فکر کو دامن گیر کرتے ہوئے انھیں حقیقت کے افق کو سلام کرنا تھا۔ نور الحسنین صاحب نے پہلا ریڈیائی ڈرامہ 'انتظار' لکھا۔ جس کے مرکزی کردار یہ خود اور رضیہ بیگم تھے۔ جسے عوام نے بہت پسند کیا۔ بس پھر کیا تھا اس کے بعد تو جیسے ڈراموں اور فیچرز کی برسات سے اورنگ آباد کی زمین سیراب ہونے لگی۔ بھاگ متی، زندگی، سویرا، بندھن انسانیت کا، بیگم صاحب، پیچ، بندھن اور عدالت جیسے کئی ڈرامے منظر عام پر آئے۔ ہر ہفتے نشر ہونے والا میاں بیوی کی نوک جھونک پر مبنی ڈرامہ 'باتوں باتوں میں' تو سب کا پسندیدہ بن گیا اور آج بھی ہے۔ جس میں مختلف موضوعات کو نہایت مزاحیہ انداز میں تین کرداروں کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔

اسٹیج ڈراموں سے مشکل ریڈیائی ڈرامے ہوتے ہیں۔ چاہے تحریر کی بات ہو یا اداکاری کی۔ اسٹیج کے ڈرامے سمعی اور بصری دونوں عناصر پر مبنی ہوتے ہیں، جب کہ ریڈیو ڈرامہ صرف سمعی ہوتا ہے، اس لیے مکالموں میں اپنی صداکاری کے ذریعے جان ڈالنی پڑتی ہے۔ آواز اور لب و لہجہ میں اتار چڑھاؤ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ زبان پر پوری قدرت رکھنی پڑتی ہے۔ رموز و اوقاف کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں ڈرامے کی کامیابی کا سارا دار و مدار اچھے مکالموں اور اچھے صداکاروں کا مرہون منت ہوتا ہے۔ ریڈیائی ڈراموں میں موسیقی پس منظر میں بھی دے جاتی ہے اور جب سین بدلتا ہے تو اس کا اظہار بھی موسیقی کے ذریعے ہی کیا جاتا ہے۔ اس لیے اچھی موسیقی ریڈیائی ڈرامے کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔ یہاں لباس و میک اپ، تزئین و آرائش کے ذریعے حاضرین کو بہلایا پھسلایا نہیں جاسکتا۔ اس لیے بہ نسبت اسٹیج کے ریڈیائی ڈرامے میں تاثرات زیادہ مشکل ہوتے ہیں۔ نور الحسنین صاحب ان تمام مشکلات کو بہ خوبی پار کرتے چلے گئے۔ ٹیلی ویژن کی مقبولیت اور مختلف چینلوں کی بھرمار نے ریڈیو کی شہرت کو کافی نقصان پہنچایا۔ ایسے دور میں ریڈیو کی جگہ کے لیے کئی آرٹسٹ ڈراموں کا مزاج تبدیل کر رہے تھے۔ ایسے میں حسنین صاحب نے اپنے آرٹسٹ ساتھیوں کے ساتھ ایک نئی شروعات کی۔ جس میں یہ ناچیز بھی شامل ہے۔ میں نے اور حسنین صاحب نے 490 سے زائد ڈراموں میں ساتھ کام کیا۔ حسنین صاحب نے اردو کلاسیکی ادب پر مبنی تیرہ سے چودہ اپی سوڈ کے ریڈیائی سیریل پروڈیوس کرنا شروع کیے۔ جن میں میر امن کی باغ و بہار، حیدر بخش کی آرائش محفل، قصہ حاتم طائی، سند باد جہازی، علی بابا چالیس چور، میر حسن کی مثنوی سحر البیان، پنڈت دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم، مرزا فرحت اللہ بیگ کا دلی کا ایک یادگار مشاعرہ، داستان گل و صنوبر، تاریخ کے زندہ کردار، 1857 کی جنگ آزادی، اردو کے کلاسیکی شعرا کے فن و حیات پر مبنی 'ہمیں غزل ہوں' اردو کے نثر نگاروں کے فن و حیات پر مبنی 'فن کی عدالت میں' اور مجاہدین آزادی کی حیات دکھاتے ہوئے۔ ان کے علاوہ مختلف سماجی، معاشرتی اور اصلاحی موضوعات پر کئی ڈرامائی سیریل اور بے شمار ڈرامے پیش کیے اور عوام کے مقبول و پسندیدہ ڈرامہ نگار و آرٹسٹ بن گئے۔ حالاں کہ ان کی بنیادی شناخت ایک افسانہ نگار کی تھی اور ہے۔

ڈراموں پر مبنی ان کی پہلی کتاب 'حضور کا اقبال بلند رہے' ایک ادبی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے اور ہمارے نوجوانوں کے لیے بھی ایک خوبصورت تحفہ ہے۔ ان کی دوسری کتاب ہے 'انسان امر ہے' جو ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب نے تین ایوارڈ بھی حاصل کیے۔

اس کے علاوہ مرہٹواڑہ کی ادبی سرزمین سے ایک اور علاقے کا نام ذہن میں آتا ہے اور وہ ہے مقدس گرودوارہ کا شہر ناندیڑ۔ یہاں فیروز رشید صاحب نے محمد یونس اور بشیر احمد وغیرہ کے ساتھ تقریباً پورے دس سال تک اپنی اداکاری اور ڈرامہ نگاری کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر راج کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے ڈرامے ناندیڑ کے علاوہ اورنگ آباد، مالیگاؤں، احمد نگر، پربھنی، ناسک، پربھنی، لاتور اور نظام آباد وغیرہ کئی شہروں میں پیش کیے اور داد و تحسین کے حق دار بنے۔ فیروز رشید

کے ڈراموں کا مجموعہ ابھی زیر ترتیب ہے جس میں جملہ 16 ڈرامے ہیں۔ اس میں 6 ڈرامے بچوں کے لیے ہیں۔

آج اردو ڈرامے کو مزید فروغ ملنا چاہیے۔ بنگال کے بعد ریاست مہاراشٹر کا مراٹھی گجراتی دوسرے نمبر پر ہے۔ مراٹھی نے ڈرامے کی صنف کو زندہ رکھا ہے اور اس میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ان کے تماش بین اس صنف کو زندہ رکھنے کے لیے اخراجات کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ مہاراشٹرا میں اسکول اور کالجوں میں مزید ڈراموں کو اسٹیج کرنے کی ضرورت ہے۔ چاہے تحریر ہو یا اداکاری، تزئین و آرائش ہو یا موسیقی، روشنی ہو یا کیمرے کا فن، ہر طرح سے اس فن میں آگے بڑھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنی شیریں زبان کا جادو دوسروں پر بھی چلاسکیں۔ اساتذہ بھی اپنی تدریس میں بہ وقت ضرورت ڈرامے سے کام لے سکتے ہیں۔ کیوں کہ ایسی تدریس بہت موثر ثابت ہوتی ہے۔ بالخصوص تاریخ اور زبان دانی کے مضامین ڈرامے کے ذریعے بہتر انداز میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس سے طلبا میں بھی ڈرامے کے تعلق سے دل چسپی پیدا ہوسکتی ہے اور زبان پر قدرت بھی حاصل ہوسکتی ہے اور واقعات کی گہرائی کو وہ بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ ●●●

بقیہ: نواب عزیز جنگ ولا کی علمی خدمات

صفحہ ۸ سے آگے

سلطان جیسے ممتاز امرا اور بڑے بڑے علما اور شعرا اور اہل اللہ اور نامور تجار شامل ہیں، شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔

یہ کتاب مصنف کی اس خاص صفت پر جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے، بہ وجہ اولیٰ دلالت کرتی ہے، یعنی ہر ایک کام کو پوری طاقت، محنت اور توجہ کے ساتھ انجام دینا اور تصنیف کے فرائض ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا۔ اس کتاب کو بالخصوص ممالک دکن کے جہاں قوم نائطہ کثرت سے پائی جاتی ہے اور اطراف ملک میں بھی قبولیت کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ چناں چہ پنجاب یونیورسٹی نے بھی اس کو بہت پسند کیا اور اس کی معتد بہ جلدیں خریدی ہیں۔

• فن تاریخ میں مصنف ممدوح نے ایک اور کتاب موسوم بہ 'محبوب السیر' حضور آصف جاہ سادس (خلد اللہ ملکہ) کی بست سالہ حکومت پر لکھی ہے۔ یہ کتاب بھی ہندستان میں بہ نظر استحسان دیکھی گئی ہے۔

حال میں انھوں نے ایک اور کتاب جس کا نام 'عطیات سلطانی' ہے چھپا کر شائع کی ہے۔ یہ کتاب بھی مصنف کی اکثر تصنیفات کی طرح بالکل ایک نرالی تصنیف ہے۔ کتاب کا نام سننے سے فوراً یہ خیال ذہن میں متبادر ہوتا ہے کہ شاید حضور شاہ دکن نے کسی خاص موقعے پر بکثرت عطیات لوگوں کو مرحمت فرمائے ہیں، ان کی تفصیل اس کتاب میں درج کی گئی ہوگی۔ مگر جب کتاب کو کھول کر دیکھا جاتا ہے تو ایک عجیب ذخیرہ معلومات کا نظر آتا ہے جس کی نسبت جناب مولوی ابوالمظفر محمد سعید اللہ ین صاحب رامپوری نے اپنے ریویو میں بالکل درست اور بجا لکھا ہے کہ "فن تاریخ میں یہ پہلی کتاب ہے جو ہماری نظر سے گزری ہے۔ ہم بے شک واقف تھے کہ بادشاہان سلف نے اہل ملک کو بیش معاشیں ان کی گزر اوقات کے لیے عطا فرمائی ہیں اور ان کے صدقۂ جاریہ سے صدہا روزگار پر ان کی اعلا یادگار قائم ہے اور بعض صاحبان تاریخ نے کہیں کہیں اس کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس کی کیفیت اس قدر مبسوط اور دل چسپ ہے کہ اس سے فن تاریخ کا ایک مکمل ذخیرہ ہاتھ آسکتا ہے"۔

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ مصنف ممدوح ان معمولی مضامین پر بہت کم قلم اٹھاتے ہیں جن پر پہلے سے لوگ طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ یہ کتاب بھی اس قبیل کی ایک تصنیف ہے۔ ممالک دکن میں معاش داروں کا ایک جم غفیر ہے جس کو شاہان سلف وقتاً فوقتاً کثیر المقدار اور کثیر التعداد انعامات و جاگیرات وغیرہ بطور امداد معاش کے عطا ہوتی رہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے انہی انعامات اور جاگیرات کو ایک خاص ترتیب اور نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کتاب کی اصل حقیقت اور مصنف کی عرق ریزی اور تحقیقات کا حال تو بغیر اس کے کہ اس کو اول سے آخر تک مطالعہ کیا جائے، معلوم نہیں ہوسکتا۔ مگر ان میں ایک بات ایسی ہے جس کے بالاجمال بیان کردینے سے کتاب کی عظمت بہ خوبی منکشف ہوسکتی ہے۔ اس کتاب کے ورق ورق اور سطر سطر سے ریاست حیدرآباد کی عام رعایا سے بے تعصبی اور انسانی ہمدردی کا ایسا ثبوت ملتا ہے جو شاید دنیا کی کسی حکومت یا سلطنت میں نہیں مل سکتا۔ ہندو مسلمان کے معابد اور ان کے مذہبی رسوم میں جو امداد اس ریاست سے ہوتی ہے اس کے متعلق معزز مصنف کا بیان ہے کہ "ان اقسام عطیات سے جو خاص کر اس باب میں بیان ہوئی ہیں، ہم نے مسلمانوں کی معاش کی تعداد اور مقدار بہ نسبت معاش ہائے ہنود کے بہت کم پائی ہے۔ ختم خوانی، اعتکاف اور چلہ کشی کی معاشیں (جو خاص مسلمانوں سے علاقہ رکھتے ہیں) صرف خال خال ہیں۔ برخلاف اس کے اگنی ہوتر، نندادیپ اور دسا رسی کی معاشیں (جو ہنود سے متعلق ہیں) کثرت سے جاری ہیں"۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "ہمارا حتمی دعویٰ ہے کہ ہندستان کی کل دیسی ریاستوں میں سے ایک ریاست بھی سلطنت آصفیہ کے ساتھ اس خاص صفت بے تعصبی میں ہم قدم نہ ہوسکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رحم دل رئیس پر جس طرح اس کی مسلمان رعایا فدا ہے اسی طرح اس کی ہندو رعایا جاں نثار ہے۔ یہ صفت اس خاندان میں سلف سے چلی آتی ہے اور یہ برداشت صرف لفظوں میں نہیں ہے بلکہ اس کی مادّی شہادت سررشتۂ عطیات کی سیر کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمارا مالک جس طرح اسلامی تقاریب میں نذریں، پیش کشیں قبول کرکے مسلمانوں کو عزت بخشتا ہے اسی طرح اپنی ہندو رعایا کی مذہبی تقاریب میں ان کی نذریں قبول فرماتا ہے، اگر کسی نو اور سجادہ نشین درگاہ کی مہمانی میں کوتاہی نہیں ہوتی تو ساتھ ہی کسی سیاح مہاتما اور مہابیر کی خدمت اور امداد سے بھی کنارہ کشی نہیں کی جاتی۔ حیدرآباد کے چار صوبوں میں ایک کا گورنر مسلمان تو دوسرے کا ہندو ہے اور باقی کے گورنر بھی غیر مسلمان سے ہیں۔ معتمد مال کرسچین ہے تو معتمد عدالت مسلمان، اور معتمد پولیٹکل پارسی۔ تعلقہ داران اضلاع میں ہندو اور مسلمان دونوں دوش بہ دوش ہیں۔ ہائی کورٹ کے نظما میں ہندو اور مسلمانوں کا جوڑ لگا ہوا ہے، نظماے صوبہ کی بھی یہی کیفیت ہے، مجلس مددگاران عدالت اور مجسٹریٹوں میں بھی یہی نسبت ہے۔ دو معین المہام مسلمان ہیں تو ایک کرسچین اور ان پر وزیراعظم ہندو۔ یہی وجہ ہے کہ جو اتحاد و یک جہتی ریاست ممدوح کے ہندو مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ کسی ہندوستانی ریاست میں دیکھی یا سنی نہیں گئی۔ اسلامی پیشواؤں کی نذر و نیاز کی تقریبیں اور عشرۂ محرم الحرام میں عزاداری کے مراسم ہنود کے گھروں میں بھی اسی طرح جاری ہیں جیسے مسلمانوں کے گھروں میں۔

علیٰ ہذا القیاس جاتراؤں میں مسلمانان ریاست برابر ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہیں۔ جوبلی چہل سالہ کے موقعے پر ہم نے خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ خوشی و شادمانی کے اظہار میں ہر ایک مذہب و ملت کی جماعتیں ایک دوسرے پر سبقت کرنا چاہتی تھیں اور اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح ہر ایک قوم کے مردوں کی طرف سے پیش گاہ حضور نظام میں بے شمار سپاس نامے اور ایڈریس پیش ہوئے تھے اسی طرح عیسائی اور پارسی عورتوں نے بھی اس میں خوشی سے حصہ لیا تھا۔

اگرچہ یہ کتاب ایک مختص المقام مضمون یعنی ریاست حیدرآباد کے اقسام عطیات پر مشتمل ہے لیکن درحقیقت وہ عام ہندستانیوں کے لیے بھی جو مورخانہ مذاق رکھتے ہیں ویسی ہی دل چسپ اور پُرلطف ہے جیسی اہل دکن کے لیے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ سررشتۂ تحقیقات عطیات جو حضور آصف جاہ سادس (خلد اللہ ملکہ) کے عہد میمنت میں قائم ہوا ہے اگر معزز مصنف کو ایک معتد بہ مدت تک اس سے خاص تعلق نہ رہا ہوتا اور ان کی ہمہ گیر طبیعت میں اپنی ہر قسم کی معلومات سے فائدہ اٹھانے اور عمدہ نتائج پیدا کرنے کا مادّہ نہ ہوتا تو وہ اس مضمون پر ایسی دل چسپ اور مفید کتاب لکھنے میں مشکل سے کامیاب ہوسکتے تھے۔

نواب عزیز جنگ بہادر کی تصنیفات کا سلسلہ مذکورہ بالا کتابوں ہی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ اس میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انھوں نے ابھی ایک اور نادر کتاب موسوم بہ 'غرائب الجمل' ۲۱۸ صفحات پر مشتمل چھاپ کر شائع کی ہے جو فن جمل میں (جس کی رو سے واقعات کی یادداشت کے لیے تاریخی مادّے استخراج کیے جاتے ہیں) جہاں تک کہ راقم کو معلوم ہے ایک بے مثل و لاجواب تالیف ہے۔

اس کے سوا کئی سال سے آپ نے ایک فارسی ڈکشنری بھی لکھنی شروع کر رکھی ہے جس میں علاوہ فارسی الفاظ و محاورات کے ہر فارسی لفظ یا محاورے کی تحقیق کے بعد جو لفظ یا محاورہ اور اس کی جگہ اردو میں مستعمل ہوتا ہے اسے بھی ساتھ کے ساتھ بیان کیا ہے اور دونوں زبانوں کا کوئی لفظ یا محاورہ (الا ماشاء اللہ) ایسا نہیں لکھا جس پر اہل زبان کے کلام سے ایک سند یا متعدد سندیں پیش نہ کی گئی ہوں، ظاہر ہے کہ معزز مصنف نے یہ ایک ایسا کام شروع کیا ہے جس کا پورا ہونا نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں انھوں نے اس کتاب کا اندازہ فرماکر راقم سے کہا تھا کہ اگر یہ ختم ہوگئی تو ۲۸ جلدوں میں آئے گی اور ہر ایک جلد سات آٹھ سو صفحے سے کم نہ ہوگی۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ یہ کتاب میری زندگی میں ختم ہوتی نظر نہیں آتی لیکن ان کی ذات میں خدا تعالیٰ نے وہ تمام صفات جمع کردیے جو بڑے بڑے مصنفین میں دیکھے اور سنے گئے ہیں۔ ہمت، جفاکشی، ضبط اوقات، حسن انتظام، فضول کاموں سے نفرت، سلیقہ، ستھرائی اور اسی قسم کے دیگر اوصاف جو ان میں دیکھے گئے ہیں وہ بہت ہی کم لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہم کو خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ ان کی عمر میں، ان کے اوقات میں اور ان کے مساعی جمیلہ میں برکت دے گا اور ان کو اپنے اس ارادے میں کامیاب فرمائے گا۔ ●●●

نواب عزیز جنگ ولاؔ کی علمی خدمات

الطاف حسین حالیؔ

خواجہ الطاف حسین حالؔی کی یہ تحریر شمس العلما نواب عزیز جنگ ولاؔ کی علمی، ادبی اور تاریخی خدمات کے اعتراف میں لکھی گئی ہے جسے ڈاکٹر حسن الدین احمد (ریٹائرڈ آئی اے ایس افسر) نے 'ہماری زبان' میں اشاعت کے لیے بھیجی ہے۔ یہ تحریر ماہنامہ 'رفتار زمانہ' (دسمبر ۱۹۶۳) سے ماخوذ ہے۔ (ادارہ)

جن لوگوں نے زمانہ حال میں اپنی گراں بہا تصنیفات سے اردو زبان کو سرمایہ دار بنایا ہے اور اپنی لٹریری قابلیت سے جس قدر خود فائدہ اٹھایا ہے اس سے بہت زیادہ پبلک کو فائدہ پہنچایا ہے، ان میں نواب عزیز جنگ بہادر کا درجہ کسی سے کم نہیں ہے۔

وہ عرصۂ دراز تک سرکار عالی نظام (خلداللہ ملکہ) میں عمدہ خدمات پر سرفراز رہے ہیں اور اب بہ... حسن خدمت مختلف صیغوں سے معقول وظیفے پاتے ہیں۔ زمانۂ ملازمت میں ان کی تصنیف کا میدان زیادہ تر قانون میں محدود رہا۔ چنانچہ اس عرصے میں جو کتابیں آپ نے بہ حسب ضرورت مختلف اوقات میں ترتیب دیں جن کے صلے میں پانچ ہزار روپیہ سرکار عالی سے مرحمت ہوا۔ یہ کتابیں صدہا مفصلات کے تمام دفاتر میں عام قبولیت کا درجہ رکھتی ہیں اور تمام مالی اور حسابی دفتروں میں آج تک انھی سے کام چلتا ہے۔

ان قانونی تالیفات کے بعد آپ نے ایک لاجواب کتاب موسوم بہ 'سیاق دکن' ۱۳۱۳ فصلی میں شائع کی جس میں عالی قدر مصنف نے فن سیاق کی حقیقت مورخانہ طور سے بیان کی ہے۔ اگرچہ اس کتاب کا نام 'سیاق دکن' ہے لیکن درحقیقت خلافت کے زمانے سے آج تک تمام اسلامی سلطنتوں کے دفاتر میں جو طریقہ حساب کا جاری رہا ہے، یہ کتاب کلیتہً اس پر حاوی ہے۔ ہم اس کتاب کی تعریف میں شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کے ریویو کا صرف ایک فقرہ لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں جو انھوں نے کتاب مذکور کی نسبت تحریر فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہم نے تاریخ کے سیکڑوں، ہزاروں ورق الٹے ہیں اور مدت تک جستجو کی ہے کہ قدیم زمانے کی ہر قسم کے طریقۂ کارروائی سے واقف ہوں اور گو ہم نے چند معمولی باتوں کو آب و رنگ دے کر ناظرین کو محظوظ کرلیا ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ جو کچھ ڈھونڈھ کر پا سکے وہ من میں چھپا تک بھی نہ تھا۔ نواب عزیز جنگ بہادر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے صرف حسابی سیاق کے متعلق ۱۹۶ صفحے کی کتاب تیار کردی جو عجیب و غریب تحقیقات سے لبریز ہے۔

اس کتاب کے دیکھنے سے سلاطین تیموریہ کے زمانے کا طریقہ سیاق اس طرح سامنے آجاتا ہے کہ گویا ہر قسم کے دفاتر ہمارے سامنے موجود ہیں۔ یہ نادر الوجود کتاب سرکار نظام کے سررشتۂ تعلیم کے کورس میں شامل ہے اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس کی قدر ہوتی ہے۔

مصنف ممدوح جہاں تک دیکھا جاتا ہے معمولی اور پامال مضامین پر ہاتھ نہیں ڈالتے بلکہ ہمیشہ اچھوتے مضامین پر جن کی ضرورت محسوس کرتے ہیں قلم اٹھاتے ہیں۔ انھوں نے کاشت خرما، کاشت انگور اور کاشت ترکاری پر بہت بسط کے ساتھ مفید کتابیں لکھی ہیں جن میں سے اول دونوں پر سرکار عالی سے معقول انعام عطا ہوا ہے۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کے اگریکلچرل آفس نے ان پر نہایت تعریف کے ساتھ ریویو کیا ہے۔ ایک اور کتاب فن فلاحت ہی کے متعلق موسوم بہ 'علاج النباتات' زیر تصنیف ہے جس میں نباتات کی بیماریوں اور ان کے معالجات کا بیان ہے اور جو عنقریب چھپنے والی ہے۔

۱۳۲۲ میں مصنف ممدوح نے ایک اور مبسوط کتاب تقریباً پونے چھ سو صفحے کی فن تاریخ میں شائع کی تھی جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل اچھوتی ہے جس کا نام 'تاریخ النوائط' ہے۔

تاریخ دکن میں مدت سے یہ (سوال) حل طلب چلا آتا تھا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جو مدت دراز سے سواحل بحر ہند یا جنوب مغرب ہند میں نائط یا نائکی کے نام سے نامزد ہے اور جس میں بڑے بڑے اہل اللہ، والیان ملک، وزرا، امرا، علما، شعرا اور تجار ہوتے رہے ہیں اس کی اصل کیا ہے (یا یہ کوئی قوم حدیث الاسلام ہے یا کسی عہد میں سرزمین عرب سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے) اگرچہ قوم نائط کا اجمالی ذکر لغت اور تاریخ کی اکثر کتابوں میں کیا گیا ہے مگر حق یہ ہے کہ اس عقدے کے حل کرنے میں بہت سی ایسی مشکلات تھیں اور مصنفین کے بیانات میں اس قدر اختلاف تھا کہ اجمالی ذکر سے اس مرحلے کا طے ہونا امکان سے خارج تھا۔

مصنف ممدوح نے کم و بیش چھ سو صفحات کی کتاب اس ایک تاریخی سوال کے حل پر لکھی ہے اور حق بات کا سراغ لگانے میں ایسی چھان بین کی ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتی۔ ہمارے نزدیک اگر جلیل القدر مصنف خود قوم نائط کے ایک مقتدر رکن نہ ہوتے تو ان تمام الجھنوں کا سلجھنا جو اس سوال کے حل کرنے میں پیش آنے والی تھیں، ایک ایسا کام تھا جس سے شاید عہدہ برآ نہ ہو سکتے.....

سب سے بڑی مشکل اس سوال کے حل کرنے میں یہ تھی کہ قوم نوائط کے مخصوصات رسم و رواج اور القاب وغیرہ میں بہت سی باتیں ایسی موجود تھیں اور ہیں جو ہندوؤں کے بعض اقوام سے ملتی جلتی ہیں اور جن سے قوی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اقوام ہنود میں سے کوئی قوم ہے مگر معزز مصنف نے متعدد تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ قوم نائط عرب کے ان مہاجرین کی یادگار ہیں جنھوں نے زیادہ تر بنی امیہ کے زمانے میں اور کسی قدر بنی عباس کے عہد میں حکومت کی سختیوں سے تنگ آکر عرب سے ہجرت اختیار کی اور آخر کار آٹھویں صدی ہجری میں دریا کی راہ سے سواحل بحر ہند میں پہنچ کر بھٹکل، کوکن، گوا وغیرہ میں سکونت اختیار کی اور محمد ہاشم خاں نظام الملکی کی کتاب 'منتخب اللباب' سے کافی ثبوت اس بات کا دیا ہے کہ اس قوم کے لوگ جب اول ہی اول ہندوستان میں پہنچے تو ایک عرصۂ دراز تک ان کو ہندوؤں کی حکومت میں رہنا اور ان کی تمام شرائط کو منظور کرنا پڑا جو فرماں روایان وقت کی طرف سے پیش ہوئیں اور جن کی منظوری بغیر وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ ان شرائط کے موافق ان کو مذہبی عقائد کے سوا تمام امور میں ہندوانی طرز معاشرت اختیار کرنی ضروری تھی، چنانچہ جب تک وہاں کی حکومت میں انقلاب پیدا نہیں ہوا وہ تمام ہندوانی رسم و رواج کے پابند رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بھی اس قدیم طرز معاشرت کے آثار بہت کچھ قوم نائط کے اکثر گھرانوں میں پائے جاتے ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں قوم نائط کے تمام خصوصیات یعنی مذہب، لباس، زبان، طریقہ تعلیم و تربیت، کفو کی پابندی، پردے کا رواج اور دیگر رسوم اور قومی القاب جن سے ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے متمیز ہوتا ہے، ایسی تفصیل سے بیان کیے ہیں کہ تمام قوم کی طرز معاشرت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے مثلاً تعلیم نسواں کے بیان میں علاوہ سینے پرونے کے اور دیگر دست کاریوں کے الف لیلہ کی طرح کی معمائیں اور پہیلیاں بتائی ہیں جو قوم نائط کی لڑکیوں بلکہ لڑکوں کو بھی سکھائے جاتے ہیں مثلاً ساٹھ زیوروں کے نام اور ان کی تعریف بیان کی ہے جو اس قوم کی مستورات استعمال کرتی ہیں، خصوصاً قوم نائط کے مختلف قبائل کے تقریباً ستر القاب اور ان کی وجہ تسمیہ نہایت کاوش اور تحقیق کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل باب میں قوم موصوف کے مشاہیر کا حال جن میں سر سالار جنگ اول، حیدر علی نائک اور ٹیپو

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ: ثمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ) دو روپے، سالانہ: ۵۰ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org